(غلام گردش)

میں نے کیا احتجاج کرنا ہے!

اصغر علی تبسم ایک برس پہلے میرے لیے بالکل اجنبی سا انسان تھا۔جس ادارے یعنی نیشنل فرٹیلائیزر مارکیٹنگ میں کام کر رہا ہوں، وہاں سے برسوں پہلے ریٹائرڈ شدہ آدمی۔سرکاری ملازم کیلئے ریٹائرمنٹ ایک تکلیف دہ مرحلہ ہے۔شائد تبسم کیلئے بھی ہو۔مگر اس نے کبھی بھی ظاہر نہیں کیا۔اپنی ہی دنیا کا مسافر، اپنے ہی قافلہ کا اکیلا شخص۔ایک برس پہلے اصغر میرے پاس آیا، تو اسے کسی قسم کا کوئی کام نہیں تھا۔یعنی میرے دفتر سے اسکا کوئی مفاد وابستہ نہیں تھا۔کہنے لگا کہ فیصل آباد سے تعلق ہے اور تیس پینتیس برس سرکاری ملازمت کی ہے۔جاتے ہوئے مجھے کچھ کتابیں دیں دی۔چار پانچ کتابیں۔بلکہ ان میں نثر کی ایک کتاب تو بے حد ضخیم تھی۔بتانے لگا، میری شاعری کی کتابیں ہیں، موقع ملے تو پڑھیے گا ضرور۔جب سے لکھنا شروع کیا ہے، ہفتہ میں ایک دو کتابیں موصول ہوتی رہتی ہیں۔کچھ کا دیباچہ پرکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کو نہیں پڑھنا چاہیے۔کچھ کتابیں پڑھنی پڑتی ہیں۔جب تھوڑی سے فرصت ملے تو ورق گردانی ہو ہی جاتی ہے۔اصغر علی تبسم کی کتابوں کے ساتھ بالکل یہی ہوا۔دفتر سے واپسی پر اپنی چھوٹی سی سٹڈی کی میز پر کتابیں رکھ دیں اور پھر بھول گیا۔تبسم ایک بڑا انسان ہے، اسلیے پلٹ کر کبھی نہیں پوچھا کہ میری شاعری کیسی لگی۔ویسے میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ کسی بھی طرح کی شاعری پر بات کر سکوں۔اپنی کم علمی کا احساس بھی ہے اور ملال بھی۔بہر حال چار پانچ ماہ تک یہ تمام کتابیں انتہائی حفاظت سے کھلے، ٹیبل پر پڑی رہیں۔نئی نکور۔صاف ستھری۔چند دن پہلے، ویسے ہی سٹڈی میں آیا تو اصغر علی تبسم کی کتابیں بالکل سامنے دھری تھیں۔پڑھنا شروع کر دیا۔پہلی کتاب "آتشِ احساس" تھی۔کمال شاعری، بے حد اعلیٰ شاعری۔پھر اندازہ ہی نہیں ہوا کہ گھنٹوں گزر چکے ہیں۔اگلی شام، اسکی دوسری کتاب، "میں نے کیا احتجاج کرنا ہے" غور سے پڑھی۔شاندار اور پختہ شاعری۔افسوس اس بات کا ہوا کہ چند ماہ گزر گئے اور اس بڑے شاعر سے استفادہ نہیں کر پایا۔مگر صاحب، اب افسوس کس کس چیز کا کریں۔لگتا ہے کہ چند برسوں سے خوشی، غم، افسوس، یاس اور اُمید کی منزل عبور کر لی ہے۔لگتا ہے کہ کوئی جذبہ ہی سانس نہیں لے رہا۔زندگی بلکہ سرکاری غلامی کے بھکیڑوں اور ناانصافی نے ذہن پر وہ وہ چرکے لگائے ہیں، کہ خدا کی پناہ۔مگر نقصان پہنچانے والے تمام لوگوں کو معاف کر دیا۔مجھے تو اب بڑے بڑے سرکاری اکابرین بھی مٹی کے گھوڑے نظر آتے ہیں۔انکا اصل دین پیسہ اور صرف پیسہ ہے۔اسکے حصول کیلئے یہ سیاسی رہنماؤں کی رکھیل بننے پر بھی فخر کرتے ہیں۔ابھی تک سرکاری قید میں ہوں۔ریٹائرمنٹ کے بعد چند معاملات ضرور لکھونگا۔ضرور، لوگوں کے سامنے سچائی پیش کرونگا۔جو کرپشن میرے ہم عصروں اور سرکاری درباریوں نے کی ہے۔وہ اس قدر خوفناک ہے کہ لوگوں کو اسکی طغیانی اور جہت کا قطعاً اندازہ نہیں۔عوام کا رخ تو سیاسی رہنماؤں کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔اصل جرائم تو سرکاری ملازم کرتا ہے۔اس معاشی لوٹ مار میں ہر ادارے کے شرفاء شامل ہیں۔خاکی بھی اور نوری بھی۔انسان بھی اور فرشتے بھی۔جنات بھی اور پریاں بھی۔

خیر بات اصغر علی تبسم کی بلند پایہ شاعری کی ہو رہی تھی۔تبسم سے تھوڑی سی دوستی ہوئی تو معلوم ہوا کہ اَز حد سفید پوش انسان ہے۔شہرت اور پیسے سے دور بھاگنے والا دیوانہ۔اور تو اور، اس نے اپنی شاعری کو بھی فروخت کر کے کوئی مقام حاصل کرنے کی کوئی کوشش

نہیں کی۔کسی ادبی گروہ کا حصہ نہیں بنا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کبھی بھی ادبی قذاق نہیں بن پایا۔بقول شہرت بخاری کے "اصغرعلی تبسم اُردو کے شعری حلقوں میں اتنے معروف نہیں ہوئے جتنا انکو ہونا چاہیے تھا۔ پروفیسر سہیل اختر کے ذریعے معلوم ہوا کہ نفیس آدمی ہیں۔ضرور نفیس آدمی ہونگے کہ اگر نہ ہوتے تو ایسے اچھے شعر کیسے تخلیق کر لیتے جیسے انہوں نے کیے ہیں"۔شہرت بخاری کی بات سو فیصد درست ہے۔اصغرعلی تبسم ادبی حلقوں میں قطعاً معروف نہیں ہوئے۔مگر دیکھا جائے تو یہی اسکی اصل طاقت ہے۔وہ تو سب سے علیحدہ کھڑا ہو کر اپنے غم کا اسیر ہو کر، بس لکھے جا رہا ہے۔ستائش اور نمائش سے ہزاروں نوری برس دور۔ایسے بے غرض لوگ اب صرف اور صرف کہانیوں میں ملتے ہیں۔اصغرعلی تبسم لکھتا ہے

جو بھی آیا ہے، عجب اس نے قیامت کی ہے
ہم غریبوں سے یہاں کس نے مروت کی ہے
جان اپنی بھی لگے سب کو بچانا مشکل
کب یہاں لوگوں نے سچ کہنے کی جرات کی ہے
میں نے اپنے لیے خود ہجر کی گھڑیاں چُن لیں
میں نے اُڑتے ہوئے پنچھی سے محبت کی ہے
تیرے گھر میں تو تبسم سدا غربت ناچے
تو نے کیا سوچ کے سچ کہنے کی جرات کی ہے

اور پڑھیے

حسن کے قرینے ہیں
آرزو کے زینے ہیں
یوں نہ اپنے دل کو چیر
زخم کس نے سینے ہیں
حسن کے خزینے میں
عشق کے دفینے ہیں
خارِ گُل کی نوکوں پر
بلبلوں کے جینے ہیں
ہم نے جان رکھا ہے
ہم نے زہر پینے ہیں

آگے چلیے،

وہ زلف، وہ رخسار، وہ آنچل بھی نہیں ہے
وہ شہر میں رنگینیٔ محفل بھی نہیں ہے
کچھ تھا جو برسنے لگے ہر سمت سے پتھر
اب شہر کا ہر شخص تو پاگل بھی نہیں ہے
یوں لگتا ہے وہ شہر ہے بھوتوں کا بسیرا
ہاں اتنا تو سناٹے میں جنگل بھی نہیں ہے
اے جذبۂ دل! سوچ کے طوفان اُٹھانا
جذبوں کے سمندر کا تو ساحل بھی نہیں ہے

تبسم ایک جگہ خوفناک بات لکھتا ہے۔ "اے خدایا تو نے مجھے کس دور میں پیدا کیا۔ میرے بزرگ پاکستان بنانے کی جدوجہد میں ختم ہوگئے ۔ میں نے زندگی بنانے کی جدوجہد میں ساری عمر گزاردی۔ میرے بزرگوں اور میری تمام جدوجہد کا صلہ کیا ہے؟ نتیجہ کیا ہے؟ میری اگلی نسل بھوک اور افلاس کا شکار ہے۔ اے خدا! میں کس سے فریاد کروں؟ میں کس سے احتجاج کروں؟ دل تھام کر بتایئے۔ کیا اصغر علی تبسم کے لکھے ہوئے فقرے لافانی نہیں۔ کیا ان میں درد، غم اور بے بسی کا طوفان اُمڈ کر باہر نہیں آرہا۔ کیا وہ یہ نہیں لکھ رہا کہ خدارا، اس ملک میں انصاف کرو۔ معاشی، سماجی، اقتصادی اور فکری انصاف۔ کیا یہ چند درج شدہ کلمات ایک نوحہ نہیں ہیں۔ مگر یہاں کون سنتا ہے اور کیوں سنے۔ سب اپنے اپنے دل پسند مشاغل کے غلام ہیں۔

تبسم کیا خوب اشعار لکھتا ہے

زخمِ احساس پھر سے پگھلنے کو ہے
درد انگارہ بن کر دہکنے کو ہے
خوف سے سارے طائر ہیں سہمے ہوئے
آگ گلشن پہ جیسے برسنے کو ہے

ایک اور غزل میں کیا خوب کیفیت ہے

یاں سب ہی سب سے خوفزدہ
یاں سب ہی سب کے دشمن ہیں
جس باغ پہ قابض زاغ وجن
اس باغ میں بلبل کیا بولے

اور مدھر مدھر سے گیتوں سے
ہر پھول کے کان میں رس گھولے
یاں، ظلم اور خوف کی آتش میں
ہر تتلی کے پر راکھ ہوئے

اور آخر میں تبسم کیا قیامت ڈھاتا ہے۔ کیا نظم ہے صاحب کیا نظم ہے۔

میری تہذیب بھی ہے خطرے میں
میرا ایماں بھی ہوا کمزور!
میری سوچوں پہ بھوک کا پہرا
میرے پاؤں میں حکم کی زنجیر
سر پہ دہشت کی ایک تنی تلوار
میرا ماحول ظلم کی جاگیر
میں تو پتلی ہوں ایک مداری کی
میں نے کیا احتجاج کرنا ہے!

راؤ منظر حیات